(۱۹)

تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی اور مولانا عبیداللہ سندھی

(از مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد)

مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب (لاہور) نے ''تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کی خدمت میں ہدیۂ فکر'' کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے، جو مولانا موصوف کی اجازت سے ذیل میں مکمل نقل کیا جارہا ہے۔(مؤلف)

تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی درحقیقت تنظیم فکرِ سندھی ہے

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس تنظیم میں فکرِ ولی اللّٰہی کا عنصر بھی موجود ہے، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ مولانا سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے افکار سے خوب استفادہ کیا ہے، لیکن تنظیم میں غلبہ مولانا سندھی کے لٹریچر کو حاصل ہے، اور تنظیم والے خود اعتراف کرتے ہیں کہ مولانا سندھی اپنے فکر وفلسفہ میں منفرد تھے، بلکہ تفسیر میں بھی وہ خاصی حد تک منفرد تھے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ یہ تنظیم درحقیقت فکرِ سندھی کی تنظیم ہے۔

مولانا سندھی کا فکر وفلسفہ میں انفراد

تنظیم کے مفتی عبدالخالق آزاد صاحب مولانا سندھی کے انفراد کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا...... نے طویل جلاوطنی کے دوران ایک دوسرے سے الگ جغرافیائی حدود میں واقع مختلف ممالک کی سیاحت کی اور وہاں پر موجود قدیم سماجی اداروں

اور پرانے نظامہائے حیات کو اپنی آنکھوں سے ٹوٹتے دیکھا، اور جدید نظام پر سماجی تشکیل نو کے تیز رفتار کاموں کا بھی بخوبی مشاہدہ کیا، اس طرح مختلف معاشروں کی بنیادی ساخت اور ان میں کام کرنے والے واقعی کردار اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا خوب غور وفکر اور تجزیاتی نقطہ نگاہ سے آپ نے مشاہدہ کیا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے برِصغیر پاک و ہند کی سیاسی، معاشی اور سماجی شناخت سے محرومی کا معروضی حقائق کی بنیاد پر ایک ایسا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا، جو معمولی ردوبدل کے ساتھ آج بھی اس خطے میں موجود معاشرتی حقائق کے صحیح خدوخال کو واضح کرتا ہے۔

قدیم وجدید سماجیات کے اس وسیع مطالعہ اور سائنسی بنیادوں پر حقیقت پسندانہ غور وفکر نے ان کے سامنے برصغیر کی سماجی تشکیلِ نو کے راہنما خطوط واضح کر دیئے۔ انہوں نے مکہ معظّمہ میں سایۂ حرم میں بیٹھ کر ان پر مزید غور وفکر کیا، اور سماجی تشکیلِ نو کے لئے ایک مربوط فکر اور جامع فلسفہ ترتیب دیا۔ اس کی روشنی میں ایسا نظامِ عمل تجویز کیا، جس سے برصغیر پاک و ہند میں بسنے والی تمام اقوام اپنے اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے مسائل حل کر سکتی تھیں''۔ (تفسیر المقام المحمود ص ۵۳)

جناب مفتی عبدالخالق آزاد صاحب نے خوب وضاحت فرمادی کہ یہ سارا فکر مولانا عبیداللہ سندھی کا اپنا تھا۔ اپنے دور کے حالات کا انہوں نے خود مطالعہ کیا، خود غور وفکر کر کے ایک جامع فلسفہ ترتیب دیا، تو اس کو فکر سندھی ہی کہنا موزوں ہوگا، فکرِ ولی اللّٰہی کہنا یقیناً حد سے تجاوز ہوگا۔ اس فلسفہ کو پیش کرنے میں مولانا اپنے زمانے کی تعبیرات سے زیادہ متاثر ہیں اور کہیں کہیں وہ حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

مولانا سندھی کا تفسیر میں انفراد

اسی طرح تفسیر میں بھی اگرچہ مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہ کی الفوزُ الکبیر اور حجۃُ اللہ البالغہ سے استفادہ کیا، لیکن اس میں جو راہِ عمل انہوں نے اختیار کی، وہ ان کی اپنی حاصل کردہ ہے، شاہ ولی اللہ کی نہیں۔

مفتی عبدالخالق آزاد صاحب لکھتے ہیں:

”قرآن حکیم کے حوالے سے مولانا سندھی کے فکری ارتقاء کا سفر ابتدائی تعلیم کے زمانے سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے آپ نے اپنے استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کی رہنمائی میں متقدمین و متاخرین کی تفاسیر کا مطالعہ کیا بالخصوص، امام شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتابوں سے آپ کو بہت مدد ملی اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد قرآن حکیم کو سمجھنے کے حوالہ سے ایک مربوط فکر اور راہِ عمل سامنے آ گئی۔

اس تناظر میں آپ نے قرآن حکیم پر تدبر کا سلسلہ شروع کیا اور قرآن پاک کے معروضی مطالعہ کی روشنی میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے الفوزُ الکبیر میں جن اصولِ تفسیر کی نشاندہی کی تھی انہیں اپنے پیشِ نظر رکھا۔ نیز حجۃُ اللہ البالغہ میں دین کے جن بنیادی اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور ہر سطح پر جس طرح سیاسی تشکیل و تفسیر کے بلند شعور کا اس کتاب میں تذکرہ ملتا ہے، مولانا نے اس سے بہت حد تک استفادہ کیا۔ اس طرح گردوپیش میں موجود انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے لئے مولانا کے سامنے ایک مربوط فکر پر مبنی قرآنی حکمت کا بڑا وسیع افق روشن ہوگیا۔ یوں مولانا سندھی کے منفرد تفسیری اسلوب کا آغاز ہوتا ہے۔

مکہ معظّمہ کے قیام کے دوران آپ کا فکری ارتقاء پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے اور

آپ کا تفسیری اسلوب اور قرآن فہمی کا منہج بڑی جامعیت کے ساتھ سامنے آتا ہے" (المقام المحمود ص۵۴،۵۵)

مولانا سندھی کا ربطِ آیات کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ سے انفراد

مولانا سندھی کہتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ عام طور پر قرآنی معارف کو بیان کرتے وقت آیات کے باہمی ربط اور نظم کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ ان کا کہنا ہے کہ عربوں کی قوم ان پڑھ تھی۔ اس ان پڑھ قوم کو سمجھانے کے لئے ان کی عادات اور مزاج کے مطابق خود ان کے طرز بیان اور محاورات میں قرآن نے اپنے مقاصد بیان کئے ہیں"۔ (ص ۹۸ افادات وملفوظاتِ مولانا عبیداللہ سندھی، از پروفیسر سرور)

توجہ نہیں فرماتے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فی الجملہ ربط کے قائل ہیں، لیکن کسی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی بلکہ شاہ صاحب ربط کے قائل ہی نہیں ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں۔

"قرآن کے ان علومِ پنجگانہ کو اس عہد کے عربوں کے محاورے کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ بعد میں متاخرین کے ہاں جس اسلوب کا رواج ہوا، قرآن نے اپنے طرزِ بیان میں اس کی پیروی نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ ایک بات کہتے کہتے دوسری بات بیان کر دینے اور ایک مطلب سے دوسرے مطلب پر آنے کے لئے جو مناسبت اور تمہید ضروری سمجھی جاتی ہے اس کی رعایت نہیں کی گئی۔ بلکہ جس چیز کو بندوں کے لئے اہم سمجھا اسے بیان کر دیا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی بات مقدم آ گئی تو اسے مقدم رہنے دیا گیا اور اگر کوئی بات موخر ہو گئی تو اسے موخر رہنے دیا" (ص ۹۸ بحوالہ افادات وملفوظات از پروفیسر سرور)

جبکہ مولانا سندھی کے بارے میں پروفیسر سرور لکھتے ہیں:

''مولانا کابل جانے سے پہلے قران کی جو موجودہ ترتیب ہے اس کی سورتوں اور آیات کے ربط پر بہت زور دیتے تھے، چنانچہ جن حضرات نے اس دور میں مولانا سے قرآن پڑھا تھا انہوں نے اپنی بعض تالیفات میں قرآن کے ربطِ سورو آیات کو خاص طور سے پیش کیا ہے'' (افادات وملفوظات از پروفیسر سرور ص ۹۶)

مولانا سندھی کے قرآنی افادات تفسیر ہیں یا علمِ اعتبار: تنظیم کے افراد کا اس کے بارے میں اختلاف

تمہید کے طور پر پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مجتہدین کے نزدیک لفظ کی اپنے معنیٰ پر دلالت کرنے کی جو قسمیں معتبر ہیں ان میں سے کسی دلالت کے ذریعہ نص قرآنی سے کوئی حکم ملتا ہے تو اگر وہ صریح ہے تو اس کو تفسیر کہتے ہیں اور اگر استنباط سے ہو تو اس کو اجتہاد وتاویل کہتے ہیں۔

اگر نص سے کسی معتبر دلالت کے ذریعہ حکم ثابت نہ ہوتا ہو لیکن نص کے جو معنی ہیں اس کے ساتھ کچھ مناسبت ومشابہت ہونے کی وجہ سے اس حکم کی طرف بھی ذہن متوجہ ہوتا ہو، پھر اگر یہ حکم خود مطلوب شرعی ہے اور کسی دوسری نص سے ثابت ہے تو اس کو علمِ اعتبار کہتے ہیں اور بطور تشبیہ اس حکم کو اس نص کے تحت شامل کر سکتے ہیں اور یہ جائز ہے اور اگر یہ حکم شرعاً مطلوب ہی نہ ہو تو پھر اس کو آیت کے تحت شامل کرنا ناجائز ہے (ماخوذ از التقصیر فی التفسیر)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی علمِ اعتبار کو تفسیر سے خارج سمجھتے ہیں اور الفوزُ الکبیر میں لکھتے ہیں:

واما اشاراتِ صوفیہ واعتبارات ایشان بحقیقت از فنِ تفسیر نیست

ترجمہ: صوفیہ کے اشارات واعتبارات درحقیقت فن تفسیر سے خارج ہیں۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ علمِ اعتبار فنِ تفسیر سے خارج ہے تو اب ہم مولانا سندھی کی فنِ تفسیر اور علمِ اعتبار سے متعلق چند باتوں کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔

تنظیم کے مفتی عبدالخالق آزاد صاحب تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مولانا سندھی دلالت کی معتبر اقسام کے فقہی طریقوں سے استنباط کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

''اس سلسلے میں استدلال اور استنباط کے وہ تمام طریقے اختیار کئے جو نصوص سے استنباط احکام کے لئے متقدمین فقہاء ومفسرین کے ہاں مسلمہ حیثیت کے حامل ہیں۔کہیں بھی آپ نے سطحی علماء کی طرح محض ''استیناس'' پر اپنے استدلال کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ نصوص کی عبارت، اشارت، دلالت اور مقتضٰی کو پیشِ نظر رکھ کر قرآنی نصوص کی تشریح وتفسیر فرمائی'' (المقام المحمود: ص۵٦)

اس کے برخلاف تنظیم کے جناب مفتی سعید الرحمٰن صاحب اس بارے میں شک میں ہیں اور وہ مولانا سندھی کے قرآنی افادات کو علمِ اعتبار کے تحت شامل کرنے پر تیار ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔

''الغرض مولانا عبیداللہ سندھی کے قرآنی افادات اگر معروف اور محدود معنوں میں تفسیر کے زمرے میں شامل نہ بھی ہوں، تب بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اعتبار، تاویل اور نظیر ماورد بہ القرآن کے دائرے سے کسی صورت تجاوز نہیں کرتے'' (المقام المحمود ص٦٢)

پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود جناب مفتی سعید الرحمٰن صاحب 'المقام المحمود'' کو تفسیر ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں'' زیرِ نظر تفسیر میں مولانا سندھی کے حوالہ سے قرآن حکیم کی حکمت کو عصری اندازِ فکر کے حوالہ سے اجاگر کیا گیا ہے''۔ یوں یہ تفسیری مجموعہ......'' ''اس تفسیر کو اس انداز میں ......'' (المقام

المحمود ص ۶۵)

اور خود کتاب کا نام بھی تفسیر المقام المحمود ہے۔

فکرِ ولی اللّٰہی کے مدعی ہو کر شاہ ولی اللہ کی اس تصریح کے برخلاف کہ علمِ اعتبار فنِ تفسیر سے خارج ہے، اعتبار کو بھی تفسیر کہے جانا عجیب بات ہے۔ پھر یہ بھی نہ دیکھنا کہ جس حکم کو اعتبار کہہ کر لیا ہے وہ شرعا مطلوب بھی ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

تنبیہ: آگے جو باتیں ذکر کی جارہی ہیں ان کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ تنظیم والے خود ان سے متفق نہ ہوں گے صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ کتابیں خود تنظیم کے ذمہ دار حضرات نے شائع کی ہیں اور انہوں نے ان پر کوئی انکار نہیں کیا ہے۔ دوسرے وہ تو یہ ترغیب بھی دیتے ہیں کہ ''احبابِ فکر اس تفسیر کو نہ صرف پسند کریں گے بلکہ اس کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل کا جائزہ بھی لے سکیں گے'' (قرآنی شعور انقلاب ص ۱۶۳)

تفسیری غلطیاں

i- عبادت کے معنیٰ و تفسیر میں غلطی

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ گویا ہم اعلان کرتے ہیں کہ اللہ ربُّ العزۃ کے سوا ہم کسی کے غلام نہیں ہیں۔ ہم اسی کی غلامی کرتے ہیں اپنے سارے دل کے ساتھ، اپنی ساری عقل کی معرفت کے ساتھ اور اپنے اعضاء و جوارح کی پوری تابعداری کے ساتھ''۔

''ہم تیری ہی حکومت تسلیم کرتے ہیں۔ تیری کتابِ دستور قرآن حکیم کے کسی حکم

سے سرتابی نہیں کریں گے''۔

''وہ اس (قرآن) کے ہر حکم کی خوشدلانہ تعمیل کرے گا یہی عبادت ہے''

''ہم خالص محبت کے ساتھ، دل کھول کر اور عقل کے ذریعہ پوری معرفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں پوری خوشی وخرمی کے ساتھ اپنے اعضاء و جوارح کو اس کے حکموں کی پیروی میں لگا دیتے ہیں اور غیر اللہ کو کسی معبودیت کا حقدار نہیں سمجھتے۔ گو عبودیت کے معنیٰ واضح ہیں، لیکن بعض اوقات اس لفظ کے مجازی استعمال سے شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے معنیٰ معین کر دیئے جائیں'' (قرآنی شعور انقلاب ص ۸۶،۸۷)

مولانا سندھی نے عبادت کا جو مطلب یہاں بتایا ہے اور اس کی جو تفسیر کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ وہ اس کا حقیقی معنیٰ غلامی اور مکمل تابعداری بتاتے ہیں اور اس کا مجازی استعمال نماز روزہ وغیرہ میں کرتے ہیں اور انہوں نے تصریح کی ہے کہ اس کے مجازی استعمال سے حقیقی معنی میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ اس کے حقیقی معنی کا مصداق نماز روزہ وغیرہ ہیں اور اس کا مجازی استعمال دیگر معاملات میں ہے۔

امام راغب رحمہ اللہ اپنی مفردات میں لکھتے ہیں۔

العبودية اظهار التذلل والعبادة ابلغ منها لا نها غاية التذلل ولا يستحقها الامن له غاية الافضال وهو الله تعالیٰ

عبودیت اظہارِ تذلل کو کہتے ہیں۔ عبادت اس سے اونچا درجہ ہے کیونکہ یہ انتہائی درجے کی تذلل و عاجزی کا نام ہے اور اس کا مستحق صرف وہی ہے جو انتہائی درجہ کا فضل کرنے والا ہو اور وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

۲۔ تفسیر بیضاوی میں ہے۔

العبادة اقصى غاية الخضوع و التذلل......ولذٰلک لا تستعمل الا فی الخضوع للّٰہ تعالیٰ.

ترجمہ: عبادت انتہائی درجہ کی عاجزی اور تذلل کو کہتے ہیں۔

۳۔علامہ شامی نقل کرتے ہیں۔

قال الامام اللامشی رحمه الله العبادة عبارة عن الخضوع و التذلل و حدها فعل لا یراد به الا تعظیم اللّٰہ بامرہٖ.

امام لامشی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عبادت خضوع اور تذلل کو کہتے ہیں اور اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسا فعل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے صرف اس کی تعظیم کرنا مراد ہو۔

۴۔شاہ اسماعیل شہید تقویۃ الایمان میں شرک فی العبادۃ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

''عبادت کہتے ہیں ان کاموں کو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے واسطے اپنے بندوں کو بتلائے ہیں''۔

اس سے پیشتر لکھتے ہیں۔

بعضے کام تعظیم کے اللہ نے اپنے واسطے خاص کئے ہیں کہ ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ و رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اور اس کے نام پر مال خرچ کرنا اور اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے کہ یہ لوگ اس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں۔

۵۔خود شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

العبادة هو التذلل الاقصى و كون تذلل اقصى من غيره لا يخلو

اما ان یکون بالصورة مثل کون هذا قیاما وذالک سجودا أو بالنیة

(حجۃ اللہ البالغہ ص ۶۰)

عبادت انتہائی درجے کے تذلل کو کہتے ہیں اور تذلل کا انتہائی درجے کا ہونا ایک تو ظاہری صورت کے اعتبار سے ہوتا ہے مثلاً (ہاتھ باندھ کر) کھڑا ہو جائے یا سجدہ میں گر جائے دوسرے نیت سے ہوتا ہے......

ان حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ عبادت کا حقیقی معنیٰ کامل اطاعت اور تابعداری اور غلامی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم خاطر انتہائی درجے کی پستی و عاجزی کو اختیار کرنا ہے۔اس معنیٰ کو مجازی کہنا درست نہیں۔

حدیث میں بھی عبادت، اللہ تعالیٰ کے لئے تعظیمی افعال کو کہا گیا ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب شمائل ترمذی میں ایک عنوان یوں باندھا ہے۔

باب ما جاء فی عبادة النبی صلی الله علیه وسلم (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں) اور اس عنوان کے تحت ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز وغیرہ کا ذکر ہے۔

۱۔ عن ابی سعید قال قال رجل ای الناس افضل یا رسول الله قال مومن یجاهد بنفسه وماله فی سبیل الله قال ثم من قال ثم رجل معتزل فی شعب من الشعاب یعبد ربه (مسلم)

ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا آدمی افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ مومن افضل ہے جو اپنی جان و مال کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرے۔اس شخص نے پوچھا اس کے بعد کون افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جو سب سے الگ ہو کر کسی گھاٹی میں چلا جائے اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہے۔

یہ عبادت کیا چیز تھی جس کو جہاد کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ عن انس قال جاء ثلاثة رهط الى بيوت ازواج النبى ﷺ يسالون عن عبادة النبى ﷺ فلما اخبروا بها كانهم تقالوها...... (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (صحابہ میں سے) تین آدمی نبی ﷺ کی ازواج کے پاس آئے اور ان سے نبی ﷺ کی عبادت (کے معمولات) کے بارے میں پوچھا۔ جب ان کو وہ بتائے گئے تو انھوں نے گویا ان کو قلیل سمجھا......

سوچنے کی بات ہے کہ یہ حضرات کس چیز کو عبادت کہہ رہے ہیں اور ازواجِ مطہرات اس سے کیا سمجھ رہی تھیں جو انھوں نے صرف نماز روزے کا ذکر کیا۔

۳۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يا ابن آدم تفرغ لعبادتى املاء صدرك غنى اسد فقرك والا تفعل ملأت يدك شغلا ولم اسد فقرك (ترمذی)

اے ابن آدم تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا میں تیرے سینے کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو دور کر دوں گا اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تیرے ہاتھ کو شغل سے بھر دوں گا (یعنی بہت سے تفکرات میں مبتلا کر دوں گا) اور تیرے فقر کو بھی بند نہیں کروں گا (تو تُو ہر وقت مزید طلب گار رہے گا)

غور کرنے کی بات ہے کہ آخر کس قسم کی عبادت کے لئے اوقات کو فارغ کرنے کے لئے ترغیب دی جا رہی ہے؟ بندہ یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میں دنیا کے دوسرے کام آپ کی تابعداری ہی میں کر رہا ہوں اور عبادت سرانجام دے رہا

ہوں۔اب آپ مجھے کس قسم کی عبادت کی طرف بلا رہے ہیں؟

البحر الرائق کے مصنف ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اعلم ان مدار امور الدین متعلق بالاعتقادات والعبادات والمعاملات والمزاجر والآداب...... والعبادت خمسة الصلوٰة والزکٰوة والصوم والحج و الجهاد......

جان لو کہ امور دین کے مدار کا تعلق عقائد، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب کے ساتھ ہے......عبادات پانچ ہیں یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد۔

تنبیہ 1: مباحات پر عبادت کا اطلاق

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اما المباحات فتختلف صفتها باعتبار ما قصدت لاجله فاذا قصد بها التقوی علی الطاعات ام التوصل اليها كانت عبادة كالاكل والنوم واكتساب المال والوطء.

رہے مباحات تو ان کی صفت اس اعتبار سے مختلف ہوتی ہے کہ وہ کس غرض سے کئے جا رہے ہیں۔جب ان سے طاعت پر قوت حاصل کرنے کی غرض ہو یا ان کو طاعت کا ذریعہ بنانا مقصود ہو تو اس وقت مباحات عبادت بن جاتے ہیں مثلاً کھانا، سونا، مال کمانا اور جماع کرنا۔

مباحات کو جو اس وقت عبادت کہا گیا ہے تو یہ مجازی استعمال ہے اور اس وجہ سے ہے کہ ثواب اصل میں عبادت کے کام پر ملتا ہے۔جب اچھی نیت کی وجہ سے مباح کام پر بھی ثواب ملتا ہے تو اس کو مجازاً عبادت کہا جاتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں:

ہر کہ طعام برائے آں خوردتا اوراقوتِ علم و عمل بود و قدرتِ رفتن راہِ آخرت طعام

خوردن وے عبادت بود و برائے این گفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ مومن را بر ہمہ چیز ثواب بود تا بر لقمہ کہ در دہاں خود نہد یا در دہاں اہل خود۔ واین برائے آں گفت کہ مقصود مومن ازیں ہمہ راہ آخرت بود۔

(ترجمہ) ہر وہ شخص جو اس لئے کھاتا ہے تاکہ اس کو علم اور عمل پر قوت حاصل ہو جائے اور راہِ آخرت پر چلنے کی طاقت میسر ہو جائے اس کا کھانا کھانا عبادت ہے اور اسی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن کو ہر چیز پر ثواب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جو وہ اپنے منہ میں ڈالے یا اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے اور یہ آپ نے اس لئے فرمایا کہ ان سب سے مومن کا مقصود راہِ آخرت ہوتا ہے۔

تنبیہ 2

ہم مکمل تابعداری کو عبادت کا اعتباری معنیٰ بھی نہیں مان سکتے، کیونکہ مولانا سندھی نے یہاں عبادت کے لفظ کا معنیٰ بتایا ہے جو کہ تفسیر ہی ہوسکتا ہے۔

ii- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی احیاءِ موتیٰ کی طلب کے قصہ کی غلط تفسیر

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا. وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ.

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ان آیات کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مردے۔ فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا۔ کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو۔ فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے

والے، پھر ان کو ہلا لے اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا، پھر ان کو بلا لے، چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے۔ اور جان لے بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

خود حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اس کے تفسیری نوٹ میں لکھتے ہیں۔

''حضرت ابراہیم علیہ السلام حسبِ ارشادِ الٰہی چار پرندے لائے...... اور چاروں کو اپنے ساتھ ہلایا تا کہ پہچان رہے اور بلانے سے آنے لگیں پھر چاروں کو ذبح کیا پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے ایک پر، پر رکھے ایک پر سب کے دھڑ رکھے ایک پر پاؤں رکھے......''

حاصل یہ ہے کہ صحیح تفسیر کے مطابق چار پرندوں کو لے کر ذبح کیا گیا اور ان کے ٹکڑے کر کے مختلف پہاڑوں پر رکھے گئے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے احیائے موتیٰ کی کیفیت دکھائی۔ اس کے برخلاف مولانا سندھی ابو مسلم اصفہانی کی ناقابلِ التفات بات کو لے کر یوں تفسیر کرتے ہیں۔

''ابراہیم علیہ السلام کو چاروں پرندوں کے سدھانے کی ہدایت کی جاتی ہے جو اس کے بلانے پر دور کے پہاڑوں سے بھاگے ہوئے آتے ہیں۔ عربی زبان میں طیر جمع ہے اور طائر واحد ہے۔ تو صحیح معنیٰ یہ ہوں گے کہ پرندے کی چار قسمیں لے لو۔ ہر ایک قسم بہت سے افراد پر مشتمل ہو، اگر پرندے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بلانے پر فوراً اس کے پاس آ موجود ہوتے ہیں حالانکہ وہ ان کے نہ خالق اور نہ حقیقی مالک تھے......''

''ابو مسلم اصفہانی نے تمام مفسرین کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور آیت کے معنیٰ یہ قرار دیئے کہ خدا نے تمثیل کے طور پر ابراہیم سے کہا کہ مثلاً اگر تم چار جانوروں کو پالو اور ان کو خوب پر چالو کہ وہ تم سے خوب ہل جائیں پھر ان کو الگ

الگ پہاڑ پر چھوڑ و اور بلاؤ تو وہ چلے آئیں گے" (تفسیر المقام المحمود ص ۴۱۰، ۴۱۱)
امام رازی جنہوں نے اپنی تفسیر کبیر میں ابو مسلم اصفہانی کا قول بھی نقل کیا ہے وہ خود اس قول پر اعتراضات بھی نقل کرتے ہیں۔

الاول ان کل المفسرین الذین کانوا قبل ابی مسلم اجمعوا علی انه حصل ذبح تلک الطیور وتقطیع اجزائها فیکون انکار ذلک انکاراً للاجماع.

پہلی وجہ یہ ہے کہ ابو مسلم سے پہلے کے تمام مفسرین کا اتفاق و اجماع ہے کہ وہ پرندے ذبح کئے گئے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ اس کا انکار کرنا تو اجماع کا انکار کرنا ہوا۔

الثالث ان ابراهیم اراد ان یریه اللّٰہ کیف یحیی الموتٰی وظاهر الآیة یدل علی انه اجیب الی ذلک وعلی قول ابی مسلم لا تحصل الاجابة فی الحقیقة

تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مراد تو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو مردے کو زندہ کرنے کی کیفیت دکھلا دیں۔ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ مراد پوری ہوئی (اور پرندے جو ذبح کئے جانے سے مردہ ہو گئے تھے دوبارہ زندہ کر کے دکھلا دیئے گئے) جب کہ ابو مسلم کے قول کو لیا جائے تو اس کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ مراد پوری نہیں ہوئی (اور ابو مسلم کی بات درست نہیں کیونکہ حضرت ابراہیم کی درخواست میں ترمیم ہونے کا ذکر نہیں ملتا، لہٰذا مردے کو زندہ کرنے والی بات کا ہونا ضروری ہے۔

مولانا سندھی نے اپنے قول کی تائید میں ابو مسلم کا ایک اعتراض بھی نقل کیا ہے۔
"اگر یہ (یعنی ذبح کرنا اور ٹکڑے کرنا) مقصود تھا تو چار پرندوں کی کیا حاجت تھی۔

ایک پرندہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا پھر اس کو جلا (یعنی زندہ کر) دینا کافی تھا۔ شک رفع کرنے کا جو تعلق ہے وہ زندہ کرنے سے ہے ایک دو چار کو اس میں کیا دخل ہے" (تفسیر المقام المحمود ص ۴۱۱)

حضرت شیخ الہند اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

"......اس کے جواب میں حـــکیـــم فرمایا......یعنی اس کو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ......کے ہر حکم میں اس قدر حکمتیں ہوتی ہیں کہ جن کا ادراک اور احاطہ اگر ہم کو نہ ہو تو یہ ہمارے نقصانِ علم کی بات ہے، اس کی حکمت کا انکار ایسے امور سے ہرگز ممکن نہیں"۔

غرض محض اتنی بات کہ تفسیری لٹریچر میں بہر حال کسی کا قول تائید میں مل جاتا ہے کافی نہیں بلکہ اس کو دلائل پر پرکھا اور تولا بھی جائے گا۔

iii- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کا انکار

مولانا سندھی آیت **بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ** کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جس طرح تمام بزرگ لوگ اللہ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، اسی طرح اللہ نے ان کو بھی اپنی طرف اٹھالیا۔ یہ انسانیت کا عام قاعدہ ہے کہ جس بزرگ کی قبر مشتبہ ہو جائے (یعنی اس بزرگ کی قبر معین نہ ہو اور لوگوں نے اس بزرگ کو کھلے طور پر دفن ہوتے نہ دیکھا ہو) تو اس کی متعدد جگہوں پر یا تو قبریں بنالی جاتی ہیں اور یا کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر چلا گیا" (تفسیر المقام المحمود ص ۶۵۱)

"الہام الرحمٰن"، جس کے حوالے مفتی عبدالقدیر صاحب "المقام المحمود" کے حواشی میں دیتے ہیں اس میں موسیٰ جار اللہ متوفیک کا معنیٰ ممیتک (یعنی موت دینے والا) نقل کرتے ہیں اور مولانا سندھی کی یہ تشریح نقل کرتے ہیں۔

"یہ جو لوگوں کے درمیان عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بارے میں مشہور ہوا ہے،

یہ یہودیوں اور صابیوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے اور یہ بات حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں مشہور ہوئی ہے۔صابیوں میں سے جولوگ بنی ہاشم کے انصار تھے ان کے واسطے سے،اور یہودیوں میں سے جولوگ حضرت علی کے انصار تھے ان کے واسطے سے مسلمانوں کے درمیان اس کی اشاعت حضرت علی کی محبت کے لئے نہیں، بلکہ اسلام اور اہلِ اسلام کے بغض ونفرت کی وجہ سے،تا کہ مسلمان اسلام کے عمومی غلبہ سے رک جائیں'' ۔

اس کے بعد جارُ اللہ صاحب نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ قرآن میں کوئی صریح آیت نہیں جو حیاتِ مسیح پر دلالت کرتی ہو اور یہ کہ وہ زندہ ہیں اور عنقریب زمین پر اتریں گے۔ یہ محض استنباطات اور تفسیرات ہیں بعض حضرات کی جو شکوک و شبہات سے خالی نہیں (الہام الرحمٰن ص ۶۹ ج ۲ بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار از مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ،ص ۶۹)

اس کے برخلاف حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے قائل ہیں۔وہ ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ....بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ

بلکہ اس کو اٹھالیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست حکمت والا۔اور جتنے فرقے ہیں اہلِ کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے۔

اس ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے تمام فرقے ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے البتہ ایک وقت آئے گا کہ سب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ایسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے ہوگا لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک حیات ہیں۔اور حضرت شاہ ولی اللہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور نزول کے قائل ہیں۔خود مولانا سندھی اس کو یوں نقل

کرتے ہیں۔ **فلن یوجد بعدک مقرب الا ولک دخل فی تربیته ظاهرا وباطنا حتی ینزل عیسیٰ علیه السلام** (محمودیه)

تیرے بعد کوئی مقرب الٰہی ایسا نہیں ہوگا جس کی ظاہری اور باطنی تربیت میں تیرا دخل نہ ہو، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں (بحوالہ: مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار۔ مؤلفہ: مولانا سواتی ص ۷۱)

تنبیہ

تنظیم فکر ولی اللّٰہی والے یہ اجمالی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے عقائد وہی ہیں جو اہل سنت کے ہیں اور اگرچہ تنظیم کے مفتی عبدالقدیر صاحب نے تفسیر المقام المحمود میں حضرت شیخ الہند کا ترجمہ بھی لکھ دیا ہے، لیکن مولانا سندھی کے اس مضمون کو انہوں نے بغیر کسی انکار کے شائع کیا ہے، بلکہ یہاں تو عنوان ہی یہ قائم کیا گیا ہے ''عیسیٰ کے اٹھائے جانے کی حقیقت اور اس کی تاریخی مثال'' غرض تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی والوں نے مولانا سندھی کے اس خیال وعقیدے کو بلا انکار لیا ہے اور وہ واضح طور پر مولانا سندھی کی اس مسئلہ میں تغلیط بھی نہیں کرتے۔

2۔ تنظیم والے اگر یہ کہیں کہ مولانا عبدالحمید سواتی نے شرح سطعات کے قلمی نسخہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا سندھی کا ایسا عقیدہ نہیں تھا، لہٰذا ہمارا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرح سطعات والا مضمون امام مہدی سے متعلق ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نہیں جس کے مندرجہ ذیل دو قرائن ہیں۔

i۔ مولانا سندھی نے ان کے لئے مصلح کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ii۔ مولانا نے یہ ذکر کیا کہ سنی وشیعہ اس میں مبتلا ہیں۔

مولانا سندھی لکھتے ہیں:

اس قسم کی فکر رکھنے کے ہم دشمن نہیں ہیں کہ ایک مصلح آئے گا۔ اس لئے کہ سنی و

شیعہ اس میں مبتلا ہیں اور حدیث میں اس کی وضاحت آ چکی ہے"(مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار از مولانا سواتی ص ۲۷)

3۔مولانا سندھی تفسیر المقام المحمود کے ص ۲۴۴ پر اس سلسلہ کی آخری کڑی کو یوں جوڑتے ہیں۔

"اب اگر ہمارا یہ خیال صحیح مان لیا جائے تو مسیح علیہ السلام کی زندگی کا جو غائب حصہ ہے (یعنی قتل کرنے کی سازش کے قصہ سے لے کر طبعی وفات تک) اسے اس طرح حل کیا جائے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں کشمیر تک پہنچے" [1]

iv-ذوی القربیٰ کی غلط تفسیر

ذوی القربیٰ کا مطلب اپنے رشتہ دار ہیں، لیکن اس کے برخلاف مولانا سندھی کہتے ہیں:

"ذوی القربیٰ یعنی وہ لوگ جو امورِ رسالت میں شریکِ کار ہیں اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پارٹی کے لوگ ہیں یہ آپ کے شخصی رشتہ دار نہیں......ذوی القربیٰ سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا سٹاف ہے۔اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار وہ ہے جو آپ کے ساتھ اس سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے جتنا وہ اپنے ماں باپ سے کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین.

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی کا بھی یہی موقف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یروشلم سے کشمیر پہنچے، جہاں ان کی طبعی موت واقع ہوئی۔مرزا غلام احمد قادیانی لکھتے ہیں: بعد اس کے مسیح اُس زمین سے پوشیدہ طور پر بھاگ کر کشمیر کی طرف آ گیا اور وہیں فوت ہوا اور تم سن چکے ہو کہ سری نگر محلّہ خانیار میں اُس کی قبر ہے (کشتیِ نوح، ص ۷۷،۷۸، روحانی خزائن، جلد ۱۹ ص ۵۷،۵۸)۔مؤلف

(تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ میں اس کو اس کے والد اور اولاد اور دیگر تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں)

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ اپنوں کا سا معاملہ کریں گے اور ان کی حاجات کی کفالت ذوی القربیٰ کی طرح کریں گے......

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کی کامیابی ان کے حزب کی کامیابی ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر یہ پوچھا جائے کہ رسول کے ذوی القربیٰ کون ہیں؟ تو بلا تامل یہی جواب دیا جائے گا کہ ''اس کی پارٹی کے ممبر'' (ہیں) مگر ایک ایسا آدمی جس نے انبیاء کی کامیابی کا ایسے نقطہ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا (وہ) کہے گا کہ رسول اللہ کے شخصی رشتہ دار'' (ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین قسم کے ذوی القربیٰ

1۔مہاجرین

2۔انصار

3۔تابعین باحسان

یہ تینوں قسم کے لوگ ذوی القربیٰ کی تفسیر ہیں (قرآنی شعور انقلاب: ص ۲۰۱۔۱۹۶)

مولانا سندھی نے ذوی القربیٰ کی یہ تفسیر اس لئے کی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل آیت میں کچھ اور ہی حکم بتاتے ہیں۔

مَآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (سورہ حشر:۷)

جو مال ہاتھ لگا دیا اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے سو اللہ کے واسطے اور رسول کے اور قرابت والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے تاکہ

نہ آئے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے۔

مولانا سندھی کہتے ہیں کہ اس طرح کے مال (یعنی مالِ فیٔ) کے پھر مندرجہ ذیل پانچ حصے ہوں گے۔

ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب تک زندہ رہیں۔

دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ (یعنی آپ کی پارٹی کے لوگ) بحیثیتِ رسالت۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں اور ان کا ذکر اگلی آیتوں میں ہے۔

i۔مہاجرین

ii۔انصار

iii۔تابعین باحسان

تیسرا حصہ یتامیٰ کے لئے

چوتھا حصہ مساکین کے لئے

پانچواں حصہ مسافر کے لئے

غرض مولانا سندھی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مالِ فیٔ میں سے ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ خاندانِ نبوی اور آپ کے رشتہ دار اسی ایک حصہ میں سے حصہ پائیں گے اور جن ذوی القربیٰ کا ذکر اسی آیت میں ہے ان سے مراد آپ کے خاندانی رشتہ دار نہیں بلکہ آپ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔

مولانا سندھی کی یہ بات بوجوہِ ذیل غلط ہے۔

1۔ذوی القربیٰ کی جو تفسیر اور اس کا جو معنیٰ مولانا نے بتایا ہے وہ عربی لغت کی رو سے درست ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا خود دوسرے مواقع پر ذوی القربیٰ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس سے مراد رشتہ دار لیتے ہیں مثلاً مولانا لکھتے ہیں۔

i۔ ’’ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ خاندانِ نبوی اور جو ذوی القربیٰ ہوئے وہ اس حصہ میں سے حصہ پائیں گے‘‘۔ (قرآنی شعور انقلاب ص۱۹۶)

یہاں مولانا نے ذوی القربیٰ کو رشتہ داروں ہی کے لئے استعمال کیا ہے۔

ii۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (سورہ شوریٰ ۲۳)

ترجمہ۔ کہہ دو میں تم میں سے کوئی اجرت نہیں مانگتا بجز رشتہ داری کی محبت کے۔

......ہم اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت کا اجر یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے اقرباء سے محبت سے پیش آنے لگیں (قرآنی شعور انقلاب ص۱۹۹)

مولانا سندھی نے یہاں قربیٰ کا ترجمہ رشتہ داری کیا ہے۔ ذو کا مطلب ہوتا ہے والا تو ذوالقربیٰ کا مطلب رشتہ داری والا یعنی رشتہ دار ہوا۔

2۔ مفسرین میں سے کسی کا قول بھی اس کی تائید نہیں کرتا۔

3۔ پھر مولانا نے اپنے قول کی دلیل میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین

یعنی یہ کہ کامل مومن وہ ہوتا ہے جو اپنے شخصی رشتہ داروں کا مقابلہ میں مجھ سے زیادہ محبت کرے۔ لیکن اس حدیث سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ ذوی القربیٰ کا معنیٰ شریعت کی نظر میں بدل گیا ہے اور یہی لوگ اب رشتہ دار کہلائے جانے کے مستحق ہوگئے۔ مولانا نے اس کو ذوی القربیٰ کی تفسیر کہا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کوئی قطعی دلیل چاہیئے۔

دینی فلسفہ کی غلطیاں

i- مقصد و ذرائعِ مقصد کا الٹا نظریہ

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''انسان کے مدِ نظر دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک مقصد بالذات ، دوسرا ذرائعِ مقصد۔ مثلاً جہاد مقصد ہے اور حج اور نماز اور زکوٰۃ ذرائعِ مقصد، حج اس لئے تھا کہ اس سے مسلمانوں میں فوجی قوت نمایاں ہو اور انہیں میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر آئندہ قتال کے لئے تیار کیا جا سکے۔ نماز اس لئے تھی کہ میدانِ جنگ میں سخت مصروف ہونے کے باوجود خدا کی یاد سے مسلمان غافل نہ رہیں اور زکوٰۃ سے مراد تھا کہ ہر ایک اپنے لئے بافراط (فراوانی سے) سامانِ جنگ خرید سکے۔ اب صرف ظاہری چیزوں یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر زور دیا جا رہا ہے گو یہ بھی فرائض سے ہیں، مگر اصلی غرض جو تھی وہ فوت ہو رہی ہے۔ غرض اب ذرائع پر تو زور دیا جا رہا ہے اور مقصد کا نام نہیں لیا جاتا'' (المقام المحمود ص ۲۴۷)

مولانا سندھی نے امورِ دین مین ترتیب ہی کو اُلٹ دیا ہے۔ مقصد کو ذریعہ اور ذریعہ کو مقصد بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ.

اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے مولانا سندھی تو عبادت کا مطلب غلامی اور مکمل تابعداری بیان کرتے ہیں جو اس وقت حاصل ہوگی جب حکومت اور اس کا قانون و انتظام بھی اللہ کے حکموں کے مطابق ہو۔ اور خدا کے حکموں کی پابند حکومت لانے کے لئے حزبُ اللہ کو جہاد کرنا ہوگا۔ جہاد کرنے کے لئے میدانِ جنگ کے نقشہ کا اندازہ ہونا چاہیئے، تو اس کے لئے حج کا حکم دیا اور جسمانی مشقتوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے تو اس کے لئے روزہ کا حکم ہوا اور اسلحہ و ہتھیار کا بندوبست ضروری ہوتا ہے جس کے لئے سرمایہ چاہیئے تو اس کی خاطر زکوٰۃ کا حکم

دیا اور ہر وقت مقصد کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، تو اس کے لئے نماز کا حکم ہوا۔

مولانا سندھی یہ سارا فلسفہ اس طرح سے اس لئے بنانے پر مجبور ہوئے کہ انہوں نے عبادت کا مطلب جاننے میں غلطی کی۔ عبادت کا صحیح مطلب ہم بیان کر چکے ہیں جو یہ ہے کہ جو ذات انتہائی درجے کی عظمت والی ہو، اس کے سامنے (دلی محبت کے ساتھ) انتہائی درجے کی تواضع و ذلت اختیار کرنا۔ اس کی صورتیں یہ ہیں کہ آدمی اس کی خوشی اور اس کی تعظیم کی خاطر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے اور اپنے آپ کو خوب جھکا دے، یہاں تک کہ اس کے سامنے اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دے، اس کے لئے کھانا پینا چھوڑ دے، اس کے نام پر اپنا عزیز مال خرچ کرے، اس کے لئے مخصوص ہیئت اختیار کرے اور نفس کے تقاضوں کو ترک کر کے سفر کرے اور اس کے گھر کے گرد دیوانہ وار چکر لگائے اور اس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دے اور اپنا خون زمین پر بہا دے۔ دوسرے لفظوں میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ عبادت کے وہ کام ہیں جن کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ غرض یہ انسان کی تخلیق کی غرض وغایت ہیں۔ جہاد بھی اگرچہ عبادت ہے لیکن وہ خود مقصود بالذات نہیں مقصود لغیرہٖ ہے۔

عبادت کی احسن اور علیٰ وجہ الاتم ادائیگی عام طور سے چونکہ اس وقت ہو سکتی ہے جب دل محبت اور تعظیم کے جذبہ سے بھرا ہوا ہو، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو ذہنی و قلبی فراغت و یکسوئی حاصل ہو۔ یہ یکسوئی اس وقت ممکن ہے جب آدمی کی ایک تو بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں، دوسرے وہ آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے امن میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں بنیادی ضرورتیں پوری ہونے کے لئے مسلمانوں کے افراد اور مسلمانوں کی اجتماعیت و حکومت کے احکام دیئے وہیں آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے بچنے کے لئے آپس کے معاملات

کے بارے میں احکام اور ہدایات عطا فرمائیں۔

غرض حکومت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہونے کا انتظام کرے اور لوگوں کو آپس کے جھگڑوں اور ظلم سے بچائے تا کہ لوگوں کو یکسوئی حاصل ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی احسن طریقے پر عبادت کرسکیں اور حکومت حاصل ہوتی ہے جہاد سے، لہٰذا جہاد اگرچہ خود ایک عبادت ہے، لیکن اس سے بھی مقصود نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کا قیام ہے۔

اسی کو قرآن پاک میں فرمایا:

اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ.

وہ لوگ کہ اگر ہم کو ان کو زمین میں حکومت عطا کریں تو وہ نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔

مولانا سندھی کا نظریہ چند اور وجوہ سے بھی غلط ہے۔

1۔ جہاد کا حکم تو بہت پہلے نازل ہو گیا تھا جب کہ حج کا حکم بہت بعد میں نازل ہوا۔ اگر حج ذرائع میں شامل ہو تو چونکہ ذرائع مقصود سے پہلے ہوتے ہیں لہٰذا ضروری تھا کہ حج کا حکم جہاد کے حکم سے پہلے دیا جاتا۔

2۔ جن لوگوں پر جہاد فرض نہ ہو تو اس کے ذرائع یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ان پر فرض نہ ہونے چاہئیں۔

3۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ ایک حدیث میں نقل کرتے ہیں۔

قال رسول الله ﷺ من خير معاش الناس لهم رجل ممسك عنان فرسه فی سبيل الله يطير على متنه كلما سمع هيعة او فزعة طار عليه يبتغی القتل و الموت مظانه أو رجل فی غنيمة فی راس

شعفة من هٰذه الشعف او بطن واد من هذه الاودية يقيم الصلاة ويؤتي الزكاة ويعبد ربه حتى ياتيه اليقين ليس من الناس الا في خير (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین زندگی اس شخص کی ہے جو اللہ کے راستے میں اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہو۔ جوں ہی وہ کوئی چیخ یا مدد کی پکار سنتا ہے تو اپنے گھوڑے پر اس طرف اڑتا ہوا جاتا ہے اور قتل وموت کے مواقع تلاش کرتا ہے۔ یا اس شخص کی ہے جو ان پہاڑ کی چوٹیوں میں سے کسی چوٹی پر یا ان وادیوں میں سے کسی وادی میں اپنی چند بکریوں کے ساتھ اور موت کے آنے تک نماز پڑھتا ہو اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو اور اپنے رب کی عبادت (کے دیگر کام) کرتا ہو۔ اس شخص کو بھی خالص بھلائی حاصل ہے۔

ii- قصہ آدم وحوا کا بے بنیاد بیان

مولانا سندھی نے اس قصہ میں جو پیوند کاری کی ہے پہلے اس کو پڑھ لیں۔

مولانا کہتے ہیں:

”اب سوال یہ ہے کہ درخت سے کیا مراد ہے؟ قرآن حکیم نے مرد اور عورت کے تعلقات کو نہایت لطافت اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ سورۃُ البقرۃ آیت نمبر ۱۸۷ میں ہے **هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ** یعنی عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو اور آیت نمبر ۲۲۳ میں **نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ** یعنی تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ بالجملہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدائش کے بعد جب باغ میں رکھا گیا تو انواع واقسام کے میوہ جات اور ہر قسم کی خوشی وخرمی کے مہیا ہونے کے باعث نشو ونما پرورش پا کر جوانی کو پہنچ رہے تھے اور ان میں خواہشاتِ نفسانی کا پیدا ہونا ضروری امر تھا۔ اس لئے پہلے ہی تاکید کر دی گئی

تھی کہ دیکھو کہ اس درخت یعنی زن وشو کے تعلقات کو نہ چھونا یعنی اس کی طرف مائل نہ ہونا۔ شیطان تو انسان کا دشمن چلا آتا ہے اور آدم کو دھوکہ دینے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا، جیسا کہ سورۂ الاعراف آیت نمبر ۱۶ میں ہے۔ اس نے قسم کھا کر آدم وحوا کو ان کے محسن ہونے کا یقین دلانا شروع کیا، جیسا کہ سورۂ الاعراف آیت نمبر ۲۰ میں مذکور ہے۔ شیطان نے قسم کھا کر انہیں یقین دلایا کہ اگر تم زن وشو کے تعلقات قائم کرو گے تو تمہارا نام قیامت تک زندہ رہے گا اور تمہاری سلطنت کو کبھی زوال نہ ہوگا۔ جس طرح شجر نشو ونما سے پھلتا پھولتا ہے اسی طرح تمہاری نسل بھی قیامت تک پھلتی پھولتی رہے گی۔ شجرہ سے جو لوگ شجرۂ نسب تعبیر کرتے ہیں اس میں بھی یہی راز مضمر ہے۔

حکمتِ ربی بھی یہی تھی کہ انسان کی نسل پھلے اور پھولے۔ جب اس طرح کنبہ ہو جائے گا تو اس سے سوسائٹی پیدا ہوگی اور بعد میں حکومت کرنے کا مادہ پیدا ہوگا...... غرض آدم علیہ السلام شیطان کے سبز باغ دکھانے میں آ گئے۔ اس وقت بہیمیت کا غلبہ ہوا اور ملکیت پر غالب آ گئی اور شیطان کی قسم پر اعتبار کر کے اس شجرہ کے وہ نزدیک گئے، جس سے انہیں منع کیا گیا تھا یعنی وہ بیوی سے ہم بستر ہوئے، جیسا کہ سورۂ الاعراف آیت نمبر ۲۱،۲۲ میں مذکور ہے۔ ایک تو شیطان نے قسم کھا کر فریب دیا دوسرا آغاز جوانی تھی۔ ان سے حکم کی نافرمانی ہوگئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے عتاب میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور ورحیم ہے۔ ان کی ندامت پر ان کی خطا سے درگزر کیا گیا یعنی اس نافرمانی کا اثر ان کے دل سے دور ہو گیا اور جب تک ان پر یہ گناہ کا اثر طبع میں تھا تو کچھ سوچ نہ سکتے تھے اور ارتفاقات (دنیاوی معاملات) کی طرف توجہ نہ تھی۔ جب ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ نافرمانی نہ تھی بلکہ اس خطا کا کرنا بھی ہماری فطرت میں رکھا ہوا ہے اور بخشش کی رحمت ان

کے دل کو تسلی دینے لگی اب وہ زمین و آسمان پر غور و فکر کرنے لگے اور تمام مسائل کو سوچنے لگے کہ کس طرح حیات کا بقاء اور روحانیت کی ترقی ہوگی۔ رہی یہ بات کہ یہ بہشت آسمانی تھی، زمین پر۔ آسمانی بہشت میں شیطان کا داخل ہونا ممکن نہیں اس لئے امام ابن قیم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ زمین پر آسمانی قوتوں (مثالی قوتوں) سے پیدا ہوئی تھی اور دوسرا یہ کہ آسمانی بہشت تھی مگر آدم میں دو قوتیں تھیں ملکیت، بہیمیت اور معراج کے معنیٰ ہیں کہ شے اپنی معدن میں پہنچ جائے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی کہ ملکیت اپنی معدن میں پہنچ گئی اور بہیمیت بھی اس کے ساتھ تھی تو جب آدم اور حوا کو معراج ہوتا تو زمین پر آ جاتے کیونکہ ملکیت اپنی معدن میں تھی، روح اپنے معدن میں تھی اور جسم خاکی کو معراج زمین پر لائی یہاں شجرہ کا معاملہ ہوا (المقام المحمود ص ۲۲۹)

مفتی عبدُ القدیر صاحب لکھتے ہیں (مجامعت کا مزہ چکھنے کے بعد جب شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں) جو پہلے سادہ پن اور بداوت کی وجہ سے ان پر پوشیدہ رہتی تھیں'' (المقام المحمود ص ۲۳۰)

مولانا سندھی کہتے ہیں جمیعا سے مراد آدم علیہ السلام اور اس کی زوجہ اور اس کی اولاد جو جنت میں پیدا ہوئی (ص ۲۳۲)

اس قصہ میں مولانا سندھی نے جو چند انوکھی باتیں کی ہیں ان پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔

1۔ ''حضرت آدم علیہ السلام کو پیدائش کے بعد جب باغ میں رکھا گیا تو انواع و اقسام کے میوہ جات اور ہر قسم کی خوشی و خرمی کے مہیا ہونے کے باعث نشو و نما پرورش پا کر جوانی کو پہنچ رہے تھے''۔

معلوم ہوا کہ پیدائش کے وقت حضرت آدم علیہ السلام بہت چھوٹے سے بچے تھے

اور نشو ونما اور پرورش پا کر وہ بڑے ہوئے اور نوجوانی کی عمر کو پہنچے اور طبع انسانی کے مطابق ان میں خواہشِ نفسانی پیدا ہوئی۔ نشو ونما کے لئے ان کو غذا کی ضرورت تھی جس کا باغ میں بہترین انتظام تھا۔

اس کے برعکس قرآن پاک میں ہے، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا:

إِنَّ لَکَ أَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی .وَأَنَّکَ لَا تَظْمَأُ فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی

(سورہ طٰہ ۱۱۸، ۱۱۹)

تجھ کو یہ ملا ہے کہ نہ بھوکا ہو تو اس میں اور نہ ننگا ہو اور یہ کہ نہ پیاس کھینچے تو اس میں اور نہ دھوپ۔

خود مولانا سندھی کے نزدیک وہ جنت سماوی بھی ہوسکتی ہے اور اس کے خواص یہ ہیں کہ وہاں کھانا پینا لذت کے لئے ہوتا ہے، ضرورت کے لئے نہیں کیونکہ ضرورت و تکلیف کا جنتِ سماوی میں گزر نہیں ہے۔

2۔ ''اس وقت بہیمیت کا غلبہ ہوا اور ملکیت پر غالب آ گئی''۔

حضرت آدم علیہ السلام، اللہ کے نبی تھے۔ بھول چوک ہونا یا اجتہادی خطا ہونا اس کو بہیمیت کے ملکیت پر غلبہ سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

3۔ ''ان میں خواہشاتِ نفسانی کا پیدا ہونا ضروری امر تھا، اس لئے پہلے ہی تاکید کر دی گئی تھی کہ دیکھو اس درخت یعنی زن وشو کے تعلقات کو نہ چھونا یعنی اس کی طرف مائل نہ ہونا''۔

یہ صحیح ہے کہ شجرہ سے کونسا شجرہ مراد ہے اس میں متعدد اقوال ہیں لیکن بلا وجہ راجح اور جمہور کے قول کو ترک کرنا بھی صحیح نہیں۔ شجرہ سے مجامعت وہم بستری مراد لینا شیخ الہند نے بھی اس کو اختیار نہیں کیا اور شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے اپنے تفسیری نوٹ میں جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا سندھی کے خیال کے بالکل خلاف ہے۔ شاہ

صاحب لکھتے ہیں:

''حاجتِ استنجا اور حاجتِ شہوت جنت میں نہ تھی۔ ان کے بدن پر کپڑے تھے جو کبھی اترتے نہ تھے کیونکہ حاجت اتارنے کی نہ ہوتی تھی اور آدم وحوا اپنے اعضاء سے واقف نہ تھے۔ جب یہ گناہ ہوا تو لوازمِ بشری پیدا ہوئے اپنی حاجات سے خبردار ہوئے اور اپنے اعضاء دیکھے''

4۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی مذکورہ بالا عبارت سے مفتی عبدُ القدیر صاحب کی یہ بات بھی غلط اور قرآن کے خلاف ثابت ہوتی ہے کہ حضرت آدم و حوا پر ان کے سادے پن اور بداوت کی وجہ سے ان کی شرمگاہیں پوشیدہ رہتی تھیں۔ مفتی عبدالقدیر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت آدم اور حوا سیدھے سادے لوگ تھے اور جاہل دیہاتی کی طرح تھے کہ ان کو اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ وہ ننگے ہیں۔ مجامعت کے بعد ان کو اپنے ننگے پن کا احساس ہوا۔

مفتی عبدالقدیر صاحب کی یہ بات نقل اور عقل دونوں کے اعتبار سے غلط ہے۔ نقلی دلیل قرآن پاک کی یہ آیت ہے۔

يَـٰبَنِىٓ ءَادَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيْطَـٰنُ كَمَآ أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ ٱلْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَٰتِهِمَآ.

''اے اولادِ آدم نہ بہکائے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکال دیا تمہارے ماں باپ کو بہشت سے اتروائے ان سے ان کے کپڑے تا کہ دکھلائے ان کو ان کی شرمگاہیں۔

عقلی دلیل یہ ہے کہ جب مولانا سندھی کے بقول حضرت آدم علیہ السلام جوانی کو پہنچے تو ان میں خواہشاتِ نفسانی پیدا ہوئیں اور ان کو پیشگی زن وشو کے تعلق قائم کرنے سے منع بھی کر دیا اور سب سے بڑھ کر یہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو

ہر قسم کا علم بھی عطا فرما دیا، لیکن مفتی عبدالقدیر صاحب کی بات کو لیں تو ان میں ایسی عجیب قسم کی سادگی اور بھولپن تھا کہ ان کو اپنی شرمگاہوں کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ پھر جمیع اسماء کا علم ہی کیا ہوا اور کیا ان کی ننگ دھڑنگ حالت ہی میں فرشتوں نے ان کو سجدہ کیا، معاذ اللہ۔

5۔ مولانا سندھی کی یہ بات کہ حضرت آدم پرورش پا کر جوانی کو پہنچ رہے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فرشتوں کے ساتھ جو قصہ پیش آیا اور فرشتوں نے ان کو جو سجدہ کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام کے بچپن کا واقعہ تھا۔ عام عقل تو اس کو قبول ہی کرنے پر تیار نہیں۔

6۔ مولانا سندھی نے حضرت آدم علیہ السلام کی معراج کا جو فلسفہ پیش کیا ہے، وہ بھی عجیب وغریب ہے۔ اول تو کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ دوسرے معراج تو عروج سے ہے۔ انسان کے اعتبار سے یہ عروج نہیں نزول ہے۔ تیسرے اس کو معراج ہی مان لیا جائے تو زمین کی طرف ہر معراج کے بعد بہشت کی طرف بھی معراج ہوتا تھا۔ یہ دوطرفہ معراج کس نقلی دلیل سے ثابت ہوگا؟

iii- عورتوں کے گھروں سے باہر نکلنے کی آزادی کا نظریہ

مولانا سندھی کہتے ہیں:

”غرض عورت کی زناکاری کی سزا چار مسلمانوں کی گواہی پر ساری عمر کی خانہ نشینی تجویز کی گئی ہے (جو بعد میں دوسری سزا سے بدل دی گئی) پس اگر عورت کو عام طور پر باہر نکلنے کی اجازت مثل مردوں کے نہ ہوتی تو اس کو خانہ نشینی کی سزا بے معنیٰ ہوتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کو مکان سے باہر نہ نکلنے دینا یا اس کو مثل قیدی کے چاروں طرف سے بند کر کے ایک جیل خانہ سے دوسرے جیل خانہ میں ڈولی یا کسی اور بند سواری کے اندر لے جانا اس کے فحش جرم کی سزا کے مترادف

ہے جو کہ صرف اسی حالت میں دی جا سکتی ہے جب کہ چار مومن اس بات کی گواہی دیں کہ یہ عورت فاحشہ ہے اور چار مسلمانوں کی گواہی کی شرط یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت کے باہر پھرنے کی آزادی کو اسلام نے کس قدر قیمتی سمجھا ہے اور دوسرے یہ کہ چار مسلمانوں کی گواہی خود اس قدر سخت ہے کہ ۹۹ فیصدی حالتوں میں چار مسلمانوں کی گواہی کا ملنا قریب قریب ناممکن ہے، جس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کا باہر پھرنے کی آزادی کا حق کس قدر مقدس اور قابل قدر ہے کہ وہ ۹۹ فیصدی حالتوں میں اس پر جرمِ زنا قائم ہو جانے کے بعد بھی اس کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کلام مجید اور احادیث سے عورتوں کی، مثل مردوں کے باہر پھرنے کی عام اجازت ثابت ہوتی ہے اور ان کو اس سے بے وجہ محروم کرنا مردوں کا ظلم ہے اور عورت کی فحش کاری کی وجہ سے خانہ نشینی کی سزا کے مترادف ثابت کرنے کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ پہلے مسلمانوں میں پردے (بے وجہ خانہ نشینی) کا ایسا رواج تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق چند تاریخی واقعات نقل کئے جاتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عام ملکی امن کی حالت میں مسلمان عورتوں کو باہر پھرنے کی اتنی ہی آزادی تھی جتنی مردوں کو بلکہ یہاں تک کہ جنگ کے زمانہ میں بھی عورتیں لڑائی کے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ جنگِ قادسیہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے زخمیوں کو عورتوں کے سپرد کیا جو ان کی تیمارداری میں مصروف ہوئیں، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں عورتیں جنگی شفاخانوں میں تیمارداری کا کام کرتی تھیں۔ وغیرہ" (المقام المحمود ص ۵۶۲)

مولانا سندھی دوسری جگہ کہتے ہیں:

"...... اس لئے ہمارے دماغ میں یہ خصوصی اثر آیا ہے کہ جب تک ہم عورتوں کو

میدان میں نہ لائیں گے یہ بے ایمان مردہ طاقت حرکت میں نہیں آئے گی، اس لئے ہم میدانِ جنگ میں آنے کے لئے مرد اور عورت کی کوئی شرط نہیں لگاتے۔ چنانچہ ہماری ہر ایک عورت اور ہر ایک لڑکی میدان میں آئے گی اور جو اس کی مخالفت کرے گا جب ہم کو نظام پر قبضہ مل گیا ہم اسے فوراً گولی سے اڑا دیں گے......ہم کسی عالم کو اس مسئلے پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے کہ عورتوں پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا۔ اس قسم کے مخذل اور بزدلی سکھانے والے لوگ اسلامی سوسائٹی سے چن کر مار دینے چاہئیں (قرآنی شعور انقلاب ص۴۹۲)

مولانا سندھی کا یہ نظریہ بھی دلائل کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک جب تک کہ عورتیں مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیتی تھیں بعض عورتیں مریضوں کی تیمارداری کے لئے لڑائی میں ساتھ گئیں، لیکن عورتوں کا جانا ایک باقاعدہ حکم نہ تھا، اس لئے بعد کے زمانہ میں پھر عورتوں کا عام طور سے جانا ثابت نہیں۔ جب عورتوں نے مسجد میں جانے کا معمول ترک کر دیا اور یہ صحابہ کے دور ہی میں ہو گیا تھا تو جہاد کے لئے تو وہ کیا نکلتیں اور مردوں کی طرح آزادی سے ان کا باہر نکلنا کیونکر متصور ہو سکتا ہے۔

عن عائشة قالت لو ادرک رسول الله ﷺ مااحدث النساء لمنعهن المسجد کما منعت نساء بني اسرائيل (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا عورتوں نے اب جو طریقے ایجاد کئے ہیں (کہ زیب وزینت کر کے گھر سے نکلنے لگی ہیں) اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو پاتے تو عورتوں کو مسجد جانے سے روک دیتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں (اپنی عبادت گاہوں میں) جانے سے روک دی گئیں۔

پھر جو عورتیں جہاد میں گئیں وہ گنی چنی چند عورتیں ہوتی تھیں اور عام طور سے

بڑی عمر کی۔ نماز کے لئے بھی سب عورتیں مسجد میں نہیں جاتی تھیں۔ بازار میں جانا ضرورت و مجبوری سے ہوتا تھا۔ اس دور کی تاریخ میں تو ہمیں یہ بات ملتی ہے جو مولانا سندھی کے فلسفہ کے یکسر مخالف ہے۔ حضرت اسماء بنتِ یزید رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں مسلمان عورتوں کی طرف سے بطور قاصد کے آپ کے پاس آئی ہوں۔ بے شک آپ کو اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ اس لئے ہم عورتوں کی جماعت آپ پر ایمان لائی اور اللہ پر ایمان لائی ،لیکن ہم عورتوں کی جماعت مکانوں میں گھری رہتی ہے، پردوں میں بند رہتی ہے، مردوں کے گھروں میں گڑی رہتی ہے اور مردوں کی خواہشیں ہم سے پوری کی جاتی ہیں، ہم ان کی اولاد کو پیٹ میں اٹھائے رہتی ہیں اور ان سب باتوں کے باوجود مرد بہت سے ثواب کے کاموں میں ہم سے بڑھے رہتے ہیں، جمعہ میں شریک ہوتے ہیں، بیماروں کی عیادت کرتے ہیں، جنازوں میں شرکت کرتے ہیں، حج پر حج کرتے رہتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر جہاد کرتے رہتے ہیں...... (حکایات صحابہ از مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ)

قرآن پاک میں وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کہہ کر گھروں میں قرار پکڑنے کو عورتوں کے لئے اصل حکم بتایا اور نکلنا مجبوری سے ہوگا۔

iv- خلیفہ کے لئے قریشی ہونے کی شرط کے بارے میں فکر و تشدد

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''جیسے یہودیوں میں یہ فکر تھا کہ ہمارے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہونا چاہئے ویسے ہی قریش بھی ایک جماعت تھی اور اب تک ہے۔ پہلا دور قریش کی حکومت کا یقیناً

گزر چکا ہے اس لئے **الائمة من قريش** کا فقرہ مسلمانوں میں راسخ ہو گیا ہے۔ یہ حدیث کس درجے کی صحیح ہے اس سے ہم بحث نہیں کرتے مگر یہ متفق علیہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بغداد کے خاتمے تک قریش ہی کی سرداری رہی۔ اس پانچ سو برس کی مدت میں جو چیز علماء وحکماء اور سیاسی جماعتوں میں مسلّم رہی وہ یہی ہے کہ امامت قریش کی ہے، لیکن بعض لوگوں نے اسے مستقل قانون ہی بنا لیا ہے۔ ایک زمانے کے لئے یقیناً قانون تھا لیکن جو لوگ اسے مستقل قانون کا درجہ دیتے ہیں ان کی ذہنیت یہود کی ذہنیت کے مشابہ ہے۔ ان لوگوں کا فکر یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والی جماعت خواہ حبشہ سے پیدا ہو یا ایران سے، ہند سے پیدا ہو یا یورپ سے، امامت ہر صورت میں قریش ہی کے لئے مخصوص ہے۔

جب ہم حدیث پڑھ چکے تو **الائمة من قريش** میں ہمیں اطمینان تھا مگر ہمارے استاد دولتِ عثمانیہ کے خلیفہ کی حمایت سکھاتے تھے۔ اس سے ہمیں شبہ پیدا ہوا کہ یہ تو قریش نہیں ہیں ان کی اطاعت کیوں کی جائے۔ ہم نے اپنے استاد سے پوچھا انہوں نے جواب دیا کہ اگر قریش میں حکومت سنبھالنے کی اہلیت نہ ہو تو کیا پھر بھی **الائمه من قريش** ہوں گے؟ ہمیں بات سمجھ میں آ گئی (قرآنی شعور انقلاب ص ۴۹۸)

مولانا سندھی کا یہ کہنا کہ جو لوگ اسے مستقل قانون کا درجہ دیتے ہیں ان کی ذہنیت یہود کی ذہنیت کے مشابہ ہے، کیسی عجیب بات ہے، کیونکہ یہ تو جمہور علمائے اسلام کا قول ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسے مولانا سندھی نے جب حدیث پڑھی تو انہوں نے اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھا، اسی طرح بعض اور لوگ بھی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ خلیفہ کے لئے صرف قریشی ہونا ہی شرط نہیں ہے کچھ اور اوصاف بھی

شرط ہیں۔لیکن ان کی نوبت تو اس وقت آتی ہے جب مسلمانوں کے اہلِ حل و عقد اوصاف کی بنیاد پر خلیفہ کا چناؤ کریں۔جب کوئی زبردست قوت فراہم کر کے حکومت پر غلبہ حاصل کر لے تو حکومت تو اس وقت بھی قائم ہو جاتی ہے خواہ اس کے اندر مطلوبہ اوصاف ہوں یا نہ ہوں، جب کہ اس کے نا اہل ہونے کے باوجود اس کو ہٹانے کی مسلمانوں میں قدرت نہ ہو۔

v- قرآن وحدیث میں مذکور وفودِ جن کے بارے میں غیر تحقیقی نظریہ

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''یہاں ایک مخفی دستورِ حقیقت کی طرف تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ عرب اپنے ایامِ جاہلیت میں ہجرت کر کے عراق اور شام میں جا بسے تھے۔انہوں نے اپنے عربی قومی خصائص ترک نہیں کئے تھے۔وہ ان غالب قوموں کے اندر مقہور زندگی بسر کر رہے تھے، جب حجاز میں عربی انقلاب رونما ہوا تو یہ عربی قبائل خفیہ طور پر مسلمان ہو گئے اور انہوں نے بعد میں مسلمان حملہ آوروں کی امداد کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق اور شام بہت جلد مفتوح ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں مکہ معظّمہ میں انہی قوموں کے مخفی ڈیپوٹیشن آتے رہے ہیں جن کو جنوں کے وفود سے تعبیر کیا گیا ہے(قرآنی شعور انقلاب ص ۱۴۸)

اس میں مولانا کی جو اور باتیں ہیں ان سے ہمیں بحث نہیں البتہ وفد جن سے مراد عربوں کے مخفی ڈیپوٹیشن لینا یقیناً بلا دلیل اور تحریف کی بات ہے۔

vi- گناہگار مسلمان کے عذاب کے بارے میں غیر اسلامی نظریہ

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''یہود کہتے تھے کہ خواہ وہ کس قدر ہی گناہگار کیوں نہ ہونگے صرف چندروز ہی جہنم میں رہیں گے اس کے بعد جنت میں آجائیں گے''۔یہود کے اس خیال کی تردید

کی جارہی ہے اور لطف یہ ہے کہ آج کل مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ مسلمان گناہگار چند دن جہنم میں رہنے کے بعد جنت میں منتقل کر دیئے جائیں گے اور باقی امتیں جہنم میں رہیں گی‘‘ (المقام المحمود ص ۲۷۵، ۲۷۶)

اس پر تنظیم کے مفتی عبدالقدیر صاحب اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ الفوزُ الکبیر میں اس خیال کو معنوی تحریفات میں شمار کیا ہے۔

مولانا سندھی کا مسلمان گناہگاروں کے بارے میں اس عقیدہ پر علی الاطلاق اعتراض کرنا اور مفتی عبدُ القدیر صاحب کا اس کو شاہ صاحب کی عبارت کے موافق بتانا دونوں ہی غلط ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت جو الفوز الکبیر میں ہے ملاحظہ فرمائیں۔

فرق میان متدین، فاسق وکافر جاحد در ہر ملتے بیان کردہ اند وکافر را خلود نار و عذابِ شدید اثبات نمودہ اند و فاسق را خروج از نار بشفاعتِ انبیاء درست کردہ اند۔ در تقریر ایں معنی در ہر ملتے اظہار نام متدین بآں ملت کردہ اند۔ و در توریت یہودی وعبری را ایں منزلت اثبات نمودہ اند و در انجیل نصرانی را دریں مرتبہ داشتہ اند و در قرآن عظیم مسلمانان را ایں مزیت نہادہ اند۔

مناط حکم ایمان است بخدا و روز آخرت وانقیاد پیغمبرے کہ برایشاں مبعوث باشد وعمل بشرائع ملت واجتناب از منہیات آں نہ خصوص ہیچ فرقہ لذا تھا۔ پس یہود دانستند کہ ہر کہ یہودی باشد یا عبری البتہ بہشتی خواہد بود وشفاعتِ انبیاء اور را خلاص خواہد ساخت و جز چند روز در دوزخ نہ خواہد ماند اگر چہ آں مناط حکم متحقق نہ شود وایمان بخدا بوجہے آوردہ باشد کہ صحیح نہ بود واز ایمان بآخرت و برسالتِ پیغمبر مبعوث بایشاں حظے ادراک نہ کردہ باشد، وایں خلط صرف است وجہلِ محض۔ چوں قرآن عظیم مہیمن سب بر کتبِ سابقہ ومبین مواضع اشکال آں شبہ را بر وجہ اتم

کشف رموز بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّأَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ فَأُولٰئِکَ أَصْحَابُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ ۔

ترجمہ: ہر مذہب میں دیندار، فاسق اور کافر کے فرق کو بتایا گیا ہے۔ کافر کے لئے ہمیشہ کی جہنم اور سخت عذاب کو ثابت کیا ہے اور فاسق کے لئے انبیاء کی شفاعت کے ذریعہ سے جہنم سے خلاصی کو صحیح بتایا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر مذہب میں دیندار کو اس مذہب کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔ توریت میں یہودی کے لئے یہ مرتبہ ذکر کیا ہے اور انجیل میں نصرانی کو یہ مرتبہ دیا ہے جب کہ قرآن میں مسلمانوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے اور اس حکم کا دارومدار خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے اور اپنے میں مبعوث رسول کی تابعداری اور دین کے احکام کو پورا کرنے اور اس کے ممنوعات سے بچنے پر ہے نہ کہ کسی فرقہ و مذہب کی خصوصیت پر۔ پس یہودی خیال کرتے ہیں کہ جو کوئی یہودی ہے وہ یقیناً جنتی ہے اور انبیاء کی شفاعت سے اس کو جہنم سے چھٹکارا مل جائے گا اگرچہ حکم کا مدار ثابت نہ ہو کہ خدا پر ایمان صحیح طور سے نہ ہو اور آخرت اور رسالت پر ایمان کا کچھ بھی حصہ حاصل نہ ہو۔ یہ تو محض خلط و جہالت ہے۔ چونکہ قرآن مجید کتبِ سابقہ کا نگران اور بیان ہے، اس لئے یہود کے اس شبہ کو خوب وضاحت کے ساتھ یوں دور فرمایا:

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّأَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ فَأُولٰئِکَ أَصْحَابُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ ۔

کیوں نہیں جس نے گناہ کمایا اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایسی کوئی بات مسلمان کے بارے میں نہیں کہی جیسی کہ مولانا سندھی کہہ رہے ہیں اور مفتی عبدالقدیر صاحب جس کی تائید کر

رہے ہیں، کیونکہ شاہ صاحب جس بات کے قائل ہیں وہ، وہ ہے جو خود شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھی ہے۔

''گناہ کسی کا احاطہ کرلیں اس کا یہ مطلب ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کرلیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو حتّٰی کہ دل میں ایمان وتصدیق باقی ہوگی تو یہ مذکور احاطہ ثابت نہ ہوگا۔تو اب کافر پر ہی یہ صورت صادق آسکتی ہے''۔

vii- بین الاقوامی حکومت کے لئے بعثت کا اختراع

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام بینُ الاقوامی حکومت کے لئے مبعوث ہوئے مگر ان کی قوم اپنے اندر یہ قابلیت پیدا نہ کرسکی اس لئے وہ بینُ الاقوامی حکومت قائم نہ کر سکے۔ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بینُ الاقوامی حکومت قائم نہ کرسکے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بینُ الاقوامی حکومت پیدا کرنے کے لئے مبعوث ہوئے اوران کے صحابہٴ کرام رضی اللہ عنہم اس کام کے چلانے کے اہل ثابت ہوئے'' (المقام المحمود ص۲۰۶)

مولانا سندھی کا یہ نظریہ عجیب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بینُ الاقوامی حکومت قائم کرنے کا مقصد دے کر بھیجا گیا، لیکن وہ اور ان کے متبعین اس مقصد کو پورا نہ کرسکے۔مولانا کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے مقصد کے اعتبار سے ناکام ہوگئے تھے۔العیاذ باللہ۔مولانا اگر یوں کہتے کہ ان حضرات کے دین میں بینُ الاقوامی حکومت قائم کرنے کی گنجائش تھی لیکن ان کی قوم اس کام کی اہل ثابت نہ ہوئی تو البتہ بات کچھ درست ہوتی لیکن مولانا تو اس سے بالکل ہٹ کر یہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ تو بین الاقوامی حکومت کے لئے مبعوث ہوئے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مقصدِ بعثت بینُ الاقوامی حکومت

قائم کرنا تھا۔

viii- سنت و عترت کے بارے میں ناقص فلسفہ

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو چیزیں چھوڑ گئے ہیں (1) قرآن حکیم (2) عترت۔ قرآن مسلمانوں کے لئے صحیح پروگرام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت یا اقرباء یا ذوی القربیٰ ان تینوں الفاظ کا مطلب ہمارے ہاں ''سنٹرل کمیٹی'' ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری نسبی جن لوگوں سے تھی ان کو آپ کا قائم مقام ماننا ایک بڑی سخت غلطی ہے۔ آپ کے قائم مقام وہ جماعت ہوتی ہے جو آپ کی مرضی کے مطابق عمل کرتی ہے اور یہی جماعت فقط رسول کی حیثیت سے رسول کے اقرباء ہو سکتے ہیں...... آپ کی ازواجِ مطہرات جو عورتوں کو تعلیم دینے میں امام ہیں وہ بھی اس جماعت میں داخل ہیں۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جس وقت اپنے آپ کو خلافت کے لئے پیش کیا تو کہا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت میں سے ہوں۔ غرض ابو بکر صدیق بھی آپ کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ یہ بھی اس جماعت میں شامل ہیں۔ اس انٹرنیشنل باڈی کو ایک خاص خاندان میں محدود کر دینا دین کی تحریف ہوگی۔

اصل میں حدیث صرف اس قدر ہے **ترکت فیکم امرا لن تضلوا ما تمسکتم بہ کتاب اللہ** یعنی میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں کہ جب تک تم اس کو مضبوطی سے تھامے رہو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ وہ اللہ کی کتاب (قرآن حکیم) ہے۔

اس کے بعد شیعہ نے عترتی کا لفظ بڑھا دیا اور سنیوں نے سنت رسولہ کا لفظ بڑھا دیا (المقام المحمود ص۲۶۹،۲۷۰)

اس نظریہ میں مولانا نے بہت سے غلطیاں کی ہیں جو یہ ہیں:

1۔عترت اور ذوی القربیٰ کو بعینہٖ ایک بنا دیا۔ پھر ان سے بھی مراد رسول کی مرضی کے مطابق عمل کرنے والے لوگ ہیں۔

2۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو خلافت کے لئے پیش کیا اور کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت میں سے ہوں۔

یہ دونوں باتیں خلافِ واقعہ ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو خلافت کے لئے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ وہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا نام لیا۔ جب انہوں نے اپنے آپ کو پیش ہی نہیں کیا تو اپنے آپ کو عترت میں سے کہنے کی بات بھی درست نہ ہوئی۔

3۔ یہ کہنا کہ سنیوں نے اپنی طرف سے حدیث میں اضافہ کر لیا بلاتحقیق بات ہے۔ یہ تو خود موطأ امام مالک میں حدیث ہے۔

قال رسول الله ﷺ ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله وسنة رسوله

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ شیعوں کا اضافہ ہے، زیادتی ہے۔ ترمذی میں ہے۔

عن جابر قال سمعت رسول الله ﷺ یقول یا ایها الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم به لن تضلوا کتاب الله وعترتی اهل بیتی.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا اے لوگو! میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں کہ تم جب ان کو تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے اللہ کی کتاب ہے اور میری عترت یعنی میرے اہل بیت ہیں (وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت یعنی ازواج مطہرات اور دیگر گھر والے مثلاً حضرت فاطمہ اور حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کو خوب جاننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کا بڑا حصہ ازواجِ مطہرات اور دیگر اہلِ بیت سے حاصل ہوا ہے)

ix-ایک انوکھی غلطی

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''تورات کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تعلیم دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے فرعون کے پنجہ سے اپنے آپ کو آزاد کرالیا'' (المقام المحمود ص۲۰۲)

مولانا کو خیال نہیں رہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے غرق ہونے کے بعد تورات ملی تھی۔

x-اکراہ فی الدین کے بارے میں غلط نظریہ

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''اسلام ایک انقلاب لاتا ہے۔ اس کی انقلابی پارٹی اپنی ڈکٹیٹر شپ پیدا کرنے کے لئے لڑتی ہے۔ ہم اسے اعلانیہ قبول کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے قانون کی اتنی بھی عزت نہیں کر سکتے کہ اس کے جبری غلبے کے حامی ہوں تو پھر ہمارے انقلاب کی کامیابی معلوم! قرآنی قانون کے ماتحت جو غلبہ حاصل ہوگا قرآن اسے جبر قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (سورۃ بقرہ ۲۵۶) اس آیت کا ترجمہ شاہ ولی اللہ نے یہ کیا ہے کہ قد تبین

الرشد کو لا اکراہ کی علت بنایا ہے۔ یعنی چونکہ قرآنی ہدایت اس کی مخالف قوتوں کی گمراہی سے نمایاں ہو چکی ہے اس لئے تھوڑے سے جبر کو جبر نہیں کہنا چاہئے'' (قرآنی شعور انقلاب ص ۲۰۸)

مولانا سندھی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جہاد کے ذریعے سے اسلام کے غلبہ کے قائل ہیں۔ لوگ اس کو دین میں اکراہ اور جبر کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا سندھی کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ جبر ہے، لیکن قرآن اس کو جبر شمار نہیں کرتا۔
مولانا سندھی کی یہ بات صحیح نہیں کیونکہ دین میں جبر نہ ہونا اور اعتبار سے ہے اور غلبہ اسلام اور اعتبار سے ہے۔ شاہ ولی اللہ نے قد تبین الرشد کو لا اکراہ کی علت بتایا ہے تو اس کی روشنی میں لا اکراہ فی الدین کا مطلب وہ بنتا ہے، جو حضرت شیخ الہند خود اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں۔
''جب توحید کے دلائل بخوبی بیان کر دیئے گئے، جس سے کافر کا کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے (یعنی جبراً مسلمان بنانے) کی کیا حاجت ہو سکتی ہے، عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہئے اور نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناوَ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ خود نص موجود ہے اور جو جزیہ کو قبول کرے گا اس کا جان و مال محفوظ ہو جائے گا''۔
رہا غلبۂ اسلام تو اس کا بھی کسی کو زبردستی مسلمان بنانے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ تو اس لئے ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ یعنی اسلام کو تمام ادیان پر غلبہ حاصل ہو اور لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا یعنی اللہ کا کلمہ تمام ادیان پر فائق ہو۔ لیکن اس کے باوجود کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم نہیں ہے۔

xi- سرمایہ محدود کرنے کا عجیب نظریہ

مولانا سندھی وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَنًا (اللہ کو ادھار دو بطریق احسن)

کے تحت کہتے ہیں ”زکوٰۃ کے علاوہ یہ قرضہ بھی قرآن کا قانون چلانے والی حکومت کو دیا جائے گا اور اس سے اس پر سود نہ لیا جائے گا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہر ایک شخص کو اپنا فالتو روپیہ سرکاری بیتُ المال میں جمع کرانا ہوگا، جہاں سے وہ جب چاہے واپس لے سکتا ہے۔ اور حکومت اس پر اپنی مرضی سے جس قدر چاہے نفع دے سکتی ہے، جس کی شرح وغیرہ پہلے سے طے نہ ہوگی۔ یہ نفع دینا نہ دینا اور کس شرح سے دینا یہ سب باتیں حکومت کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑنا ہوں گی“

(قرآنی شعور انقلاب ص ۳۵۶)

مولانا سندھی کی یہ بات مبہم بھی ہے اور متضاد بھی ہے۔

اول تو مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ کیا ایسا ہر حال میں کرنا ہوگا، خواہ حکومت کو عوامی سرمایہ کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

دوسرے جب ہر ایک کو جمع کرانا ہوگا اور جب چاہے واپس لے سکتا ہے تو اگر کوئی صبح جمع کرا کر شام کو نکلوالے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا۔

تیسرے اگر وہ بقدرِ ضرورت نکلوائے گا تو ضرورت کے تحقق اور اس کی مقدار کی تعیین آدمی خود کرے گا یا حکومت کے کارندے کریں گے۔ تنظیم والوں نے بھی اس پر کوئی خیال آرائی نہیں کی ہے۔

(تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کی خدمت میں ہدیۂ فکر، مطبوعہ: مکتبہ قاسمیہ اردو بازار، لاہور)